پردہ سخن کا

نذیر آزاد

PARDA SUKHAN KA

(Poetry Collection)

by

Prof. (Dr.) Nazir Azad

Address: 1) Azad Manzil Koil Pulwama, Kashmir J&K
2) Azad Manzil Salsabeel Colony, Humhama
Budgam, Kashmir
E-mail: drazad170@gmail.com

Year of Edition 2018

ISBN 978-93-88105-57-6

₹ 500/-

نام کتاب : پردہ سُخن کا

شاعر : پروفیسر (ڈاکٹر) نذیر آزاد

۱) آزاد منزل، کوئل پلوامہ، کشمیر

۲) آزاد منزل، سلسبیل کالونی، ہمہ ہامہ، بڈگام، کشمیر

سال اشاعت : ۲۰۱۸ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۵۰۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : سید ضمیر اندرابی 7006334051

سرورق : رؤف قیاسی

زیرِ اہتمام : اے۔آر۔آزاد میموریل فاؤنڈیشن، کشمیر

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

وادیٔ کشمیر کے فرزنداں

نظریۂ جمالیات کے بے بدل مُفکّر

اچاریہ ابھینو گُپت

(11 ویں صدی عیسوی)

اور

سَبکِ ہندی کے صاحبِ طرز شاعر

مُلاّ محمّد طاہر غنیؔ کشمیری

(17 ویں صدی عیسوی)

کی عظمتوں کے نام



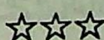
آگاہئ دِل می طلبی ترک ہُنر گیر
کز جوہرِ خود بر رُخِ آئینہ نقاب است

(ابوالمعانی بیدلؔ)



مشمولات

نظمیں



سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

چار جانب سے اونچی برفیلی پہاڑیوں کے دامن میں بسی وادی باقی دُنیا کے ہنگاموں سے بے خبر ذات، کائنات، ابتداء، انتہا، جلال و جمال اور حسن و عشق کی موشگافیوں میں مگن۔ جس کے رہنے والے رگوں میں خون منجمد کرنے والی زمستانی ہواؤں اور جسم و جان کو معطر کرنے والی گلپوش فضاؤں میں صریرِ خامہ سے ازلی اور ابدی حقیقتوں سے محوِ کلام ہوتے آئے۔ جنہوں نے سپہ گری کے بجائے فنونِ لطیفہ کے بل پر پوری دُنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کرلیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ایران و توران اور روم و یونان تک ان کے فکر و فلسفہ کی عطر بیز ہوائیں خنداں و رقصاں رہیں۔ جس کے عالموں، فلسفیوں اور ماہرین جمالیات نے سنسکرت کی دُلہن کو نایٹہ شاستر، رس، دھونِ النکار اور اوچیتیہ جیسے ہیرے جواہرات میں تول کے رکھ دیا۔ یہی گلپوش وادی اور یہی برف پوش پہاڑیاں عظیم سیّاحوں، شاعروں اور دانشوروں کو محبت کے بام سے آوازیں دیتی رہیں اور یہ متوالے اس

مقناطیسی آواز کی طرف کھنچے چلے آئے۔اس من موہنی اور گُل بہ کف زمین نے اپنی پنج ہزار سالہ باعثِ افتخار تہذیب وثقافت کی نہ صرف آبیاری کی بلکہ دُنیا کے مختلف گوشوں کو منّور کرنے والی کرنوں کو بھی اپنے اندر جذب کیا۔ جہاں اچاریوں نے فکرو فلسفہ کی گہرائیوں سے موتی چُن لئے وہیں عالموں نے کائنات کُبریٰ اور کائنات صغریٰ کے درمیان مماثلتوں کو مُو بہ مُو کھول کے رکھ دیا۔ جہاں کے عارفوں نے آتما اور پرم آتما اور ذات و صفات کا چشمِ بصیرت سے مشاہدہ کیا۔ جس میں بسنے والے شاعروں نے فارسی ادب کو سبکِ ہندی جیسے کراماتی ہُنر سے مالا مال کیا۔ جہاں کے مصوّروں نے کینواس کے دِل پر ماورائی افسانے رقم کئے۔ جہاں کے دستکاروں نے آنکھوں کا تیل جلا کر قدرت کے شاہکاروں کے حُسن کی کبھی آرتی اُتاری تو کبھی اپنے دستِ ہُنر سے لافانی بنا دیا۔

یہی وادیٔ کشمیر میرا پہلا اور آخری عشق ہے اور اس کے نباتات و جمادات سے لے کر انسانی حُسن کے بے نظیر پیکر میرے عشق کے محرکات ہیں اور ان محرکات نے مجھے فنونِ لطیفہ کی میٹھی آنچ میں برسوں پگھلا کر رکھ دیا۔ میں شاید کُندن نہ بن

سکا لیکن جمالِ ہم نشیں نے میرے جسم و جاں کو معطر کیا۔ دُور کے جینیاتی سرور کی لہریں اگرچہ مجھے دیوانہ بنانے کے لئے کافی تھیں لیکن نزدیک کے اسلاف کے رشتوں نے میرے جنون کے لئے نئے طلسماتی دروا کئے اور جذب دروں نے چھلکنے کی ضد کی۔ لیکن دُنیا برہنہ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ اس مقام پر بھی اسلاف کی جمالیات اور ایمائیت پسندی نے میری رہنمائی کی اور لفظوں میں معنی کی کثرت نے برہنہ سوچ پر شعر کا غلاف چڑھایا۔ یہ شاعری اظہار نہیں بلکہ اخفائے ذات ہے۔ بقولِ میرؔ

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

میں اپنی بے لباس سوچ پر کس حد تک پردہ ڈال سکا اس بات کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں کیونکہ متن بہر حال قاری کی ملکیت ہے۔

نذیر آزادؔ

ہمہ ہامہ (بڈگام)

9/ جولائی 2018 عیسوی


غزلیں



یہ جو میرا دستِ کمال ہے، مری جان تیرا جمال ہے
سرِ دِل جو اوجِ خیال ہے، مری جان تیرا جمال ہے

یہ جو شامِ غم ہے دھواں دھواں، تری زُلف کی ہیں یہ بدلیاں
یہ جو مہرِ تاب و مجال ہے، میری جان تیرا جمال ہے

یہی میری ہیچ اڑان ہے، کہ مآل جس کا تکان ہے
جو چمن چمن تہِ بال ہے، مری جان تیرا جمال ہے

میں کہ آپ اپنا حریف ہوں بڑا تیز و تند و کثیف ہوں
مرے ہاتھ میں یہ جو ڈھال ہے، مری جان تیرا جمال ہے

میں شہِ بساطِ معاش تھا، کہ میں ننگِ حُسنِ تلاش تھا
مگر ایک رزقِ حلال ہے، مری جان تیرا جمال ہے

نہ بلند ہوں نہ میں پست ہوں، میں رہینِ حرفِ الست ہوں
مری پستیوں میں اُچھال ہے، مری جان تیرا جمال ہے

یہاں شعلہ بار ہے آب وگل بجز ایک شاخِ نہال دِل
جو ہری یہ شاخِ نہال ہے، مری جان تیرا جمال ہے



محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر

جلوۂ طور کو پردوں میں نہاں ہونا تھا
پھر لبِ احمدِ مُرسل سے عیاں ہونا تھا

جس اُجالے نے نمو صبحِ ازل میں پائی
اُس اُجالے کو مدینے میں جواں ہونا تھا

لہلہاتی ہوئی ہر فصلِ عداوت کو، سُنو
موسمِ نور میں اِک دشتِ گماں ہونا تھا

اُس تبسم پہ فدا ہم ہیں کہ جس کی خاطر
لا مکاں بی بی حلیمہ کا مکاں ہونا تھا

مرحبا سیّدِ کونین کے گیسو کے طفیل
میرے کشمیر کو بھی رشکِ جناں ہونا تھا

ق

ہائے وہ وقت کہ جب خاکِ مدینہ جاگی
سو رہا تھا میں کہاں، مجھ کو وہاں ہونا تھا

ابروئے ناز کے مبہم سے اشارے پہ لہو
اشک بن بن کے نگاہوں سے رواں ہونا تھا

جل کے اُس روشنیٔ ارض وسماوات میں، پھر
جان و دِل روح و بدن کو تو دھواں ہونا تھا





بدن کی چیرہ دستی، بے کلی، انگڑائیاں اور میں
کسی کونے میں ساکت ان کہی، بے خوابیاں اور میں

عجیب اک خواب دیکھا تھا، تہِ مہتاب دیکھا تھا
تھرکتی تتلیاں، سمٹی کلی، پروائیاں اور میں

نہ پندارِ بُتاں باقی نہ وہ لطفِ فُغاں باقی
یونہی بیٹھے ہیں دل، آوارگی، رسوائیاں اور میں

اُدھر اگلا زمانہ ہے کہ جو تیرا ٹھکانہ ہے
اِدھر روتے رہے پچھلی صدی، آبادیاں اور میں

بہت پیاسا ہے دشتِ دل، سراسیمہ سرِ ساحل
پڑے رہتے ہیں شب بھر تشنگی، لاچاریاں اور میں

اُجڑتا شہرِ جاں دیکھیں، لہو ہوتا جہاں دیکھیں
بس اتنی فکر میں ہیں زندگی، سچائیاں اور میں





پلکوں کے آس پاس سمندر تھا اُس کو بھی
ساکت لبوں پہ ایک سُخن ور تھا اُس کو بھی

چلتی تھی بوئے رفتہ مرے ساتھ ساتھ گر
آنکھوں میں پھول سا کوئی پیکر تھا اُس کو بھی

لگتا تھا یوں کہ میں ہی قیامت کی زد پہ ہوں
پہلو میں ایک عرصۂ محشر تھا اُس کو بھی

دِل میں مرے ملال اگر تھا تو تھا سہی
اک شکوہ لیکن آپ سے شب بھر تھا اُس کو بھی

کیوں فخر اب قصیدۂ بے ہودگاں پہ ہے
دشنام یوں تو لب پہ برابر تھا اُس کو بھی

آرائشِ بدن پہ اُسے کیوں ہے ناز اب
ویسے خیالِ چشم قلندر تھا اُس کو بھی

سب حسرتوں کا بوجھ لئے میں نہ تھا فقط
چہرے پہ بارِ دانۂ گوہر تھا اُس کو بھی





سیلِ بلا ہے یا لہو اے چشم گریانی بتا
کھُل کر بتا، مُبہم بتا، بارمزِ پنہانی بتا

عمرِ گریزاں کاٹتے دو پل میں دو صدیاں ہوئیں
رفتار میں تھی کیا کجی کچھ حشر سامانی بتا

یادِ بہارِ رفتہ بھی کیوں کر نہیں آتی ہے اب
کُچھ دِل کی لغزش تھی کہ تھی آنکھوں کی نادانی بتا

میں ہوں کہ ہے زخم جگر، شعلہ بجانی شورِ سر
یا خود ترا وعدہ رہا وجہِ پشیمانی بتا

سوکھی پڑی ہر باولی، سہمی ہوئی ہر منچلی
وارفتگی! کیوں کر پیوں، کس اوک سے پانی بتا

لو شہرِ دل بھی لُٹ گیا، سب رہزنوں میں بٹ گیا
غافل تھا تُو یا سو رہا دستِ نگہبانی بتا





چاند پہلو بہ پہلو تو چلتا رہا، راستے میں کہیں چاندنی رہ گئی
ہر طرف خامشی کا تھا اک سلسلہ، رات پیہم مگر بولتی رہ گئی

روشنی شہرِ جاں سے نکلنے لگی اور درِ دِل پہ آکر دہکنے لگی
دور جاتا ہوا راستہ چل دیا، ہاتھ ملتی ہوئی تیرگی رہ گئی

لمس کو ہم نے چاہا تھا الفاظ دیں، جسم کے شہر سے تم کو آواز دیں
عشق آنکھوں سے گو بولتا ہی رہا، پر صدا زیرِ لب سوچتی رہ گئی

ایک سایہ درِ دِل سے واپس گیا، کن اجالوں کی آغوش میں بس گیا
کپکپاتا ہوا فکر وفن رہ گیا، تِلملاتی ہوئی آگہی رہ گئی

دشتِ کام و دہن میں بسر ہوگئی، زندگی اس سبب معتبر ہوگئی
تلخیوں کا بدن میں رہا ذائقہ، لب پہ تھوڑی بہت چاشنی رہ گئی



سوکھی پڑی ہر باولی، سہمی ہوئی ہر منچلی
وارفتگی! کیوں کر پیوں، کس اوک سے پانی بتا

لو شہرِ دل بھی لُٹ گیا، سب رہزنوں میں بٹ گیا
غافل تھا تُو یا سو رہا دستِ نگہبانی بتا





چاند پہلو بہ پہلو تو چلتا رہا، راستے میں کہیں چاندنی رہ گئی
ہر طرف خامشی کا تھا اک سلسلہ، رات پیہم مگر بولتی رہ گئی

روشنی شہرِ جاں سے نکلنے لگی اور درِ دِل پہ آکر دہکنے لگی
دور جاتا ہوا راستہ چل دیا، ہاتھ ملتی ہوئی تیرگی رہ گئی

لمس کو ہم نے چاہا تھا الفاظ دیں، جسم کے شہر سے تم کو آواز دیں
عشق آنکھوں سے گو بولتا ہی رہا، پر صدا زیرِ لب سوچتی رہ گئی

ایک سایہ درِ دِل سے واپس گیا، کن اجالوں کی آغوش میں بس گیا
کپکپاتا ہوا فکر وفن رہ گیا، تلملاتی ہوئی آگہی رہ گئی

دشتِ کام ودہن میں بسر ہوگئی، زندگی اس سبب معتبر ہوگئی
تلخیوں کا بدن میں رہا ذائقہ، لب پہ تھوڑی بہت چاشنی رہ گئی





(نذرِ جون ایلیا)

غلط ہے تیرا کوئی آشنا نئیں
بتا کیا خود سے تیرا رابطہ نئیں

کوئی ترمیم تجھ میں کیوں بھلا ہو
تجھے سوچا گیا، لکھا گیا نئیں

بھٹک لو خوب پھر مجھ میں سما جاؤ
تری منزل ہوں تیرا راستہ نئیں

حلاوت ہے یہ اپنی بے دلی کی
یہ میرے لب پہ تیرا ذائقہ نئیں

مرے الحاد پر خوش ہونے والے
فقط تیرا ہے کیا میرا خدا نئیں

اسی دنیا میں تھے پہلے بھی معشوق
یہی سچ ہے یہ کوئی ماجرا نئیں

میں تنہا ہوں تجھے کیونکر یقیں ہو
میرے اندر بھی کوئی دوسرا نئیں





خوش نہیں ہیں وہ مگر کوئی شکایت بھی نہیں
کیسے کہدیں کہ انہیں ہم سے محبت بھی نہیں

سوچ ہی لیتے اسیراں کہ "پسِ کوہ نِدا
کوئی شے ہے کہ نہیں" پر یہ اجازت بھی نہیں

ہم تو بس پاسِ مروّت میں ہیں لاچارِ جنوں
ورنہ زنجیرِ محبت میں وہ شدّت بھی نہیں

چل نہ پایا ہے مرے عہدِ ہُنر کا سکّہ
بے بضاعت پہ تری مُہر حکومت بھی نہیں

راس آئی نہ ہمیں شہرِ طرب کی تنگی
شارعِ غم بھی نہیں کوئے ملامت بھی نہیں





کیا ترے شہر میں ایسا بھی ہُنر ملتا ہے
برگِ گُل چومتے ہی رقصِ شرر ملتا ہے

خطۂ ذات کا پُر پیچ سفر اور یہ تپش
جب بھی تھکتا ہوں ترے غم کا شجر ملتا ہے

داستاں گو تھا کسی باب سے نکلا ہوگا
وہ جو کہتا تھا کہ دیوار میں در ملتا ہے

یہ تماشہ تو بہت خوب ہے، کس سے سیکھا
چشمِ پُرنم تو کبھی خاک بہ سر ملتا ہے

اپنے سناٹے سے گر خوف کے مارے نکلوں
پھر یہی خوف بہ انداز دگر ملتا ہے

اور کیا چاہیئے اب حلقہ بگوشانِ فریب
ہو لہو تازہ تو اک آن میں زر ملتا ہے

حیطۂ درد میں آ طائفۂ کم نظراں
پھر دِکھاؤں گا کدھر عیشِ سفر ملتا ہے

بولئے مست خرابانِ نظر! وہ نشۂ
کیا اُسی آنکھ سے ملتا ہے اگر ملتا ہے

نابکارانِ جنوں! دیکھ کہ آزادؔ اب تک
وادیٔ عشق میں بے خوف و خطر ملتا ہے





قد کے سروِ سہی زلف کے بوستاں یوں تو راہوں میں تھے سر بسر دوستو
لے کے دِل میں فقط آرزوئے زیاں ہم بھٹکتے پھرے در بدر دوستو

عمر بھر ہم قدم بن کے چلتے رہے، یار بن کر ہمیشہ سے ملتے رہے
دِل بھی ہم سے رہا بدظن و بدگماں، ہم بھی دِل سے رہے بے خبر دوستو

کچھ تو رنگین ہے استعارات سے، کچھ تو ہے طول اس میں محاکات سے
کچھ تو شامل تمہارا ہے طرزِ بیاں، اپنا قصّہ تو تھا مختصر دوستو

یوں اچانک ہوا بام و در ڈھے گئے جیسے سیلِ ملامت میں سب بہہ گئے
جب ہوئے بند ابوابِ سود و زیاں، اپنی جانب کھلا ایک در دوستو

آنے والے دنوں کا بھی اندازہ ہے، اپنے ہونے کا ایسا ہی خمیازہ ہے
ہم بھی ہوں گے کبھی شاملِ رفتگاں تم بھی بدلو گے اپنی ڈگر دوستو

تختِ غم لگ گیا قصرِ نقصان میں، قیسؔ و فرہادؔ تک ہیں غلامان میں
اپنے زیرِ تصرّف ہے شہرِ گماں سر پہ ہے تاجِ گردِ سفر دوستو

لمحہ بھر آنکھ جھپکی مری ناگہاں، اور غائب پری ہوگئی الاماں
عمر بھر کی ریاضت ہوئی رائیگاں، میں ہوا پل میں نامعتبر دوستو

خاک برسر ہوں میں سینہ صد چاک ہوں، فخر یہ ہے غلامِ شہِ پاکؐ ہوں
جن کی خاطر سجائے گئے سب جہاں، جن سے روشن ہیں شمس و قمر دوستو





نا خوش تھے جو بھی فصلِ شاخِ نہالِ دِل پر
وہ بھی ملول ہیں اب خاکِ زوالِ دِل پر

حیراں نہیں ہو تم ہی دستِ سوالِ دِل پر
ششدر رہے ہیں ہم بھی تاب و مجالِ دِل پر

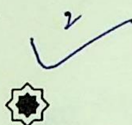
یا ایہا المعاصی! ایسی بھی کیا اُداسی
ہوتا نہیں گزارا رزقِ حلالِ دِل پر

اُس چشم سُرمگیں نے دیکھا تھا ہولے ہولے
ہالہ سا آگیا ہے دیکھو ہلالِ دِل پر

غیروں کی انجمن میں، دلبر کے بھولے من میں
ہنگامہ کیوں ہے برپا صدقِ مقالِ دِل پر

عرصہ ہوا جو پی تھی کافور ہے وہ مستی
لیکن نمی ہے باقی جامِ سفالِ دِل پر





(نذرِ عرفان صدیقی)

بابِ سُخن کو ہم نے اگر بند کردیا
خود پر نزولِ شام و سحر بند کردیا

وحشی کو تم نے قیدِ سلاسل سے چھوڑ کر
صبح و مساء میں ہائے نظر بند کردیا

جس میں وصالِ یار کا پہلو نکل سکے
ایسے خیالِ خام کا در بند کردیا

جس میں تیرا قیام نہ پھر ہو سکا کبھی
اس گھر کا در تو بارِ دگر بند کردیا

بابِ خیالِ یار سے یوں لوٹ آئے ہیں
ہم کھولنے گئے تھے مگر بند کر دیا

اے روشنی پسند مرے شہر! کس نے پھر
تجھ پر طلوعِ شمس و قمر بند کر دیا

میں بہہ رہا تھا مثلِ خس و خاک، وائے کیوں
مجھ سے کلام دیدۂ تر بند کر دیا





عالم عالم ہے دشتِ بیزاری
دشت در دشت عالمِ خواری

عشق بھی کیا بھلا ہے بیماری
عکسِ حیرت ہے آنکھ دُکھیاری

یوں سرِ شام چھوڑ کر مت جا
آج کی رات مجھ پہ ہے بھاری

ہاں فقط جاں سے ہی گزرنا ہے
اور کیا عشق میں ہے دشواری

کل تلک حالت ایسی تھی تو نہیں
ایک شب میں ہوئی ہے مسماری

بابِ خیالِ یار سے یوں لوٹ آئے ہیں
ہم کھولنے گئے تھے مگر بند کر دیا

اے روشنی پسند مرے شہر! کس نے پھر
تجھ پر طلوعِ شمس و قمر بند کر دیا

میں بہہ رہا تھا مثلِ خس و خاک، وائے کیوں
مجھ سے کلام دیدۂ تر بند کر دیا





عالم عالم ہے دشتِ بیزاری
دشت در دشت عالمِ خواری

عشق بھی کیا بھلا ہے بیماری
عکسِ حیرت ہے آنکھ دُکھیاری

یوں سرِ شام چھوڑ کر مت جا
آج کی رات مجھ پہ ہے بھاری

ہاں فقط جاں سے ہی گزرنا ہے
اور کیا عشق میں ہے دشواری

کل تلک حالت ایسی تھی تو نہیں
ایک شب میں ہوئی ہے مسماری

کیا وہی ہے عدالت و الزام
منصفی کیا وہی طرف داری

جان و دِل کی بدستِ گُل بدناں
ہورہی ہے، نئی خریداری

بول بھی کچھ خروش عمرِ عزیز
نیند کیوں راہ میں ہوئی طاری

آ ذرا خود کو توڑ کر دیکھیں
خوب گزرے گا وقتِ بے کاری

نارِ دوزخ سے کچھ ڈرو صنمو
کیا بنانا ہے ہم کو زُنّاری





جو ہر دم میری عزّت کر رہے ہو
کہو کِس سے محبت کر رہے ہو

نیا لہجہ بدن کا ہے تمہارے
سو کیا اپنی ہی قرأت کر رہے ہو

اِدھر ہم ہیں کہ چاہت کی طلب ہے
اُدھر تم ہو، مروّت کر رہے ہو

چلو اب فاصلہ رکھیں، کہ تُم بات
بہ اندازِ حکومت کر رہے ہو

ذرا دیکھو کہ تم بھی بھیڑ میں ہو
تو پھر کس کی مذمّت کر رہے ہو

یہ دِل وحشی ہے اور وحشی کو بے جا
سِدھانے کی حماقت کر رہے ہو

مری، اپنی کہ یا پھر تیسرے کی
کہو کس کی حمایت کر رہے ہو

خدا وندانِ نو! خوفِ خدا کھاو
یہ کس رہ کی ہدایت کر رہے ہو

تشکّر قیس جی! اب دشت و صحرا
مرے حق میں وصیّت کر رہے ہو

کسی سے دِل لگایا تو نہیں ہے
مری غزلیں سماعت کر رہے ہو

نذیرؔ آزاد! دنیا سے پرے ہٹ
یہ کِس موذی کی چاہت کر رہے ہو





پوچھ لیں گے اگر چناروں سے
تو جواب آئیں گے شراروں سے

مانگ بانوئے شہرِ خاکستر
اور کچھ اپنے خاکساروں سے

کچھ کہو موجِ ہائے تیرہ شبی
کیوں ہے نفرت تمہیں کناروں سے

پوچھ چشمِ ہُنر سے، کیا اب بھی
کام چلتا ہے استعاروں سے

دور جا کر، جفا شعار کرن!
دیکھتی کیا ہے اب ستاروں سے

لے کے پھرنا فسونِ چشم بہ دل
ربط میرا بنا کہاروں سے

روز کرتے بدن کی بخیہ گری
نسبت اب ہوگئی چماروں سے

کیا ہوا ہے تجھے نذیر آزاد
یوں الجھتے ہیں شہریاروں سے





کسی کنگن کسی پازیب کو چھیڑا جائے
اِک ذرا خامشیٔ شب کو سمیٹا جائے

کبھی شہر کے بیٹوں کی فضیلت کے لئے
کبھی شہر کو فی الفور نکالا جائے

ستر پوشیٔ اسیراں کے لئے؛ بہرِ کرم
حکم جاری ہے کہ زنجیر کو اوڑھا جائے

شرط یہ ہے کہ سبق خانہ خرابی کا پڑھیں
اور یہ لازم ہے اسے دھیان سے رٹّا جائے

نقشِ پا کوئی نہ آواز نہ سایہ نہ سراب
دشتِ امکان کو نقشے سے ہٹایا جائے

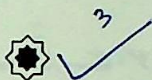
میرے حصّے کی زمیں میرے لئے تھی ہی نہیں
میرے حصّے کا فلک، خیر سے، سونپا جائے

گھر کے دروازے اُسی کوچے کی جانب رکھ دو
ورنہ اس کوچے کو گھر تک مرے کھینچا جائے

سینکڑوں موجۂ خوں اس میں انڈیلو صاحب
ہم سے دریا نہ کبھی دشت کو لکھا جائے

روز آتا ہے سوا نیزے پہ سورج میرا
کچھ نہ کچھ روز مرا مجھ میں دہکتا جائے





جو اِک بات زیرِ گلو سوگئی
تہِ خاکِ دِل آرزو سو گئی

اُتر آئی پہلو میں زلف ایسی رات
رُخِ دِل پہ پھر مُو بہ مُو سوگئی

ترے لمسِ اوّل کی وہ دھیمی آنچ
کہیں درمیانِ نمو سو گئی

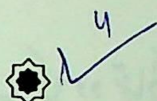
رفاقت کے لمحوں کی مرحوم خاک
گلی میں تری چار سُو سوگئی

نہ معلوم کِس کی وہ تنہائی تھی
مرے گھر بِلا ہا و ہُو سو گئی

خلل ہے کہیں، دیکھ کر فصلِ گُل
سمجھتا ہوں نہرِ لہو سو گئی

وہ دریائے صد موج کی جل پری
تہِ موجِ جام و سبُو سو گئی





سب طائرانِ غم تھے بیٹھے فصیلِ دل پر
نظریں لگی تھیں سب کی دستِ کفیلِ دِل پر

کِس شہرِ پُر الم کو باشندگانِ غم کو
نکلے ہو زیر کرنے بانگِ رحیلِ دِل پر

شامل تھا میں بھی کل شب محوِ ستم تھے واں سب
کم ظرف و کم نگہ پر یعنی ذلیلِ دل پر

دلبر تھا صبحِ خنداں مایوس و مُو پریشان
نکلا رپٹ لکھانے تھانے رذیلِ دل پر

اُس چشم و لب کا شربت بندِ قبا کی نکہت
تجویز کی گئی ہے دائم علیلِ دل پر





کچھ ہوا چل پڑی، تھوڑی بارش ہوئی، غم مچلنے لگے، اور ہم ہنس دیے
موسموں کی یہ ہم پر نوازش ہوئی درد بڑھنے لگے اور ہم ہنس دیے

وصلِ جاناں ہی شاید مقدر نہیں، اب دوا کیا دُعا بھی مؤثر نہیں
پاس آنے کی جب جب بھی خواہش ہوئی، دور جانے لگے، اور ہم ہنس دیے

اب یہی روز مرّہ کا دستور ہے، جس پہ ہر ایک شادان و مسرور ہے
ہم سے چھوٹی بڑی کوئی لغزش ہوئی، وہ بگڑنے لگے، اور ہم ہنس دیے

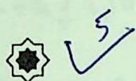
خون کے جام بھر کر پیے تھے کبھی، ان کی محفل میں لب سی لیے تھے کبھی
اب گلوں کی چمن میں نمائش ہوئی، زخم کھُلنے لگے، اور ہم ہنس دیے

گو حمیّت قبیلے میں مفقود ہے، اک روایت مگر اب بھی موجود ہے
قیس و فرہاد کی آزمائش ہوئی، ہاتھ بڑھنے لگے، اور ہم ہنس دئے

اے کُجا منصبِ عاشقی ہم کُجا، از اسیرانِ دام و دِرم رم کُجا
جرمِ الفت کی ہم پر بھی نالش ہوئی، دار سجنے لگے، اور ہم ہنس دئے

چشمِ قاتل کہاں سب کی قسمت میں ہے، اِک تبسّم مگر اپنی قدرت میں ہے
اِک ذرا اُن کے مژگان کی جنبش ہوئی، لوگ مرنے لگے، اور ہم ہنس دئے





خوفِ رقیب بھی نہیں خوابِ وصال تک نہیں
چشمِ فریب خوردہ میں حرفِ ملال تک نہیں

جس پر کہ برگِ آرزو پائے نمو بہ فیضِ وقت
دشتِ خیالِ میں وہ اِک شاخِ نہال تک نہیں

ہم سا دریدہ تن کوئی راہ جنوں میں کب اٹھا
پائے طلب تو ہے نہیں دستِ سوال تک نہیں

دانشورانِ عشق کیوں بیٹھے ہیں سرمہ در گلو
بعدِ زوالِ بے کساں رنجِ زوال تک نہیں

دستِ جنوں ہے اور کچھ پاگل کا ہاتھ اور کچھ
برگِ گلاب کیا، بچے دشت و جبال تک نہیں

وہ جن کے اختلاف سے رونق تھی شہر شہر میں
وہ روز و شب نہیں رہے وہ ماہ و سال تک نہیں





لے کے پاؤں میں نئی دربدری نکلے گی
جانے کس سمت مری بے طلبی نکلے گی

کتنے گلفام نہائیں گے لہو میں کب تک
کیا ضمانت ہے کہ زنداں سے پری نکلے گی

موجۂ بادِ صبا ہوں تو بکھر کر دیکھوں
کِس نزاکت سے تری غنچہ لبی نکلے گی

قسمت اپنی تو زمستانی ہے چلو خود دیکھو
دھوپ دالان کی چھجے سے ابھی نکلے گی

منحرف اپنا ہوں تصدیق کروں کیا تیری
میرے اثبات کے پہلو سے نفی نکلے گی

تیری شمشاد قدی ہی کا اگر سایہ ہو
شاخۂ درد کی ہر ایک کجی نکلے گی

اک نہ اک روز ہم اس اندھی گلی سے نکلیں
کیا خبر ہم سے بھی یہ اندھی گلی نکلے گی





سفر تھا جس کا ارادہ مقامِ حیرت تک
پہنچ سکا نہ بھلا کیوں نواحِ رغبت تک

مرا قیام ہے اس مے کدے میں بس دو پل
شرابِ لمس سے لے کر خمارِ ہجرت تک

ذرا سنبھل کے چلو دشتِ عشق میں صاحب
کہ ٹھوکر ایک کی دوری ہے بحرِ فرقت تک

ہم ایسے خانہ خرابوں کو کیا غمِ افلاس
ہمارے پاس نہیں ہے متاعِ غربت تک

رسوم عشق سے وہ اس قدر نہ تھے بیزار
کہ ہو سکی نہ ادا اُن سے رسمِ رخصت تک

ٹپک رہا ہے اِن آنکھوں سے قطرہ قطرہ یہ ہجر
گمان ہے کہ ٹپک جائے گی بصارت تک

چلے بھی آؤ ترے واسطے رُکے ہوئے ہیں
سمندِ بادِ سے لے کر طیورِ نکہت تک

کھٹک رہی ہے یہ فصلِ سرانِ شورہ زمین
دماغِ زُہد سے لے کر دِلِ سیاست تک





بول پاؤں بھی تو زنجیرِ کہن پڑتی ہے
اور چُپ رہنے سے سانسوں میں چبھن پڑتی ہے

ٹِکٹِکی باندھ کے کیا تیغِ تبسم دیکھوں
بس نظر بھر سے بصارت میں شِکن پڑتی ہے

چشم و عارض بھی پکاریں تو نہیں سُنتا ہوں
ہاں کبھی کان میں آوازِ بدن پڑتی ہے

گوشۂ شہرِ بُتاں میں تو اماں مِل جاتی
راہ میں مملکتِ زاغ و زغن پڑتی ہے

اک طرف لاشۂ خوشبو سے ہٹا دوں ملبہ
اک طرف سر پہ یہ دیوارِ چمن پڑتی ہے

گفتگو بوئے رمیدہ سے بلا شک کرتے
کیا کریں بیچ میں آوازِ سخن پڑتی ہے





(ابولمعانی مرزا بیدلؔ کی نذر)

بیدلی سے بھی کبھی کر سرِ سودا، سودا
دیکھ بن جاتا ہے کب خائفِ دُنیا، دُنیا

میں یہاں گریہ کناں تو ہے وہاں دریادِل
آ! ذرا رقص کرے برسرِ دریا، دریا

خامشی وجہِ اماں پیش دریدہ دہناں
یہ مری غنچہ لبی ہے لبِ گویا، گویا

یہ تو بس بھیڑ ہے، کم ظرف و بلا جذب و شعور
تجھ پہ لازم ہے نگہبانیِ تن ہا، تنہا

قصّہٴ تشنہ دہانی دِلِ مے خوار سے سُن
چُور کر دیتی ہے کب قلقلِ مینا، مینا

نام لے لے کے ترا مجھ کو پکارے عالم
اور ہو جاؤ گے کتنا پئے رسوا ، رسوا

روز اک تازہ سفر، تازہ تپش، تازہ سراب
روز بن جاتا ہے اِک ذرہٴ صحرا، صحرا





کروٹیں رات بدلتی ہے جو برہن کی طرح
چاندنی آگ لگا دیتی ہے بیرن کی طرح

دھوپ کی بخیہ گری یوں تو شفق کر نہ سکی
تار تار اور ہوئی ٹوٹتے بندھن کی طرح

چاندنی یاد کی اک لحظہ نہیں ڈھلتی ہے
تھم گیا وقت مرا ہجر کے جوبن کی طرح

کیوں بھلا جسم سے اٹھتا ہے نہ شعلہ نہ دھواں
ہڈّیاں ویسے چٹخ اٹھتی ہیں ایندھن کی طرح

شعلہ شعلہ مری آنکھوں سے ٹپکتا ہے وہ جسم
ایسی آنکھوں سے نہ رو پاؤں گا ساون کی طرح

مسئلہ میرے لئے میں ہی رہا ہوں اکثر
اپنے رستے میں کھڑا رہتا ہوں اڑچن کی طرح

یاد، گھر، دیر و حرم، شعر، گلی کے بچّے
ذہن میں دست و گریبان ہیں الجھن کی طرح

میں زمانے کے بڑے چوک میں حیراں ہوں بہت
اپنی دیوار پہ لٹکے ہوئے درپن کی طرح

میرے اوصاف، مرے عیب، مرا ماضی و حال
اہتماماً مجھے لکھتا ہے وہ کلہن[1] کی طرح

زہر میں لتھڑی ہوئی شب کی عیادت کے لئے
صبح سیندور ملے آتی ہے جوگن کی طرح



1: گیارویں صدی عیسوی کا کشمیری مورخ جس نے سنسکرت میں کشمیری کی مبسوط تاریخ لکھی۔



یاد کی گنجان گلیوں میں ٹہلنا کس لئے
عشق کی بے ساختہ راہوں سے بچنا کِس لئے

بھیگتے ننھے پرندوں کو ہوا کے ہاتھ میں
سونپنا، پھر یاد کی شمعیں جلانا کِس لئے

ایسی بے ہودہ ہوا سے گفتگو کرنا پڑی
پھڑ پھڑاتے ریشمی پردوں میں چھپنا کِس لئے

مجھ کو حرف و لفظ کے پہلو میں کر لو دفن یار
سر بریدہ فکر ہوں، آنسو بہانا کِس لئے

میں ہوا کی رہگزر ہوں تو بھی کردم بھر خرام
آئیں بھائیں شائیں یوں پہلو بچانا کس لئے

سنگساری مجھ پہ کر کے گر تجھے راحت مِلے
لو وہ پتھر ہیں یہ سر ہے کپکپانا کس لئے

ہے یہ تنہائی سیانی چورنی لے جائے گی
بیش قیمت حُسن کو آنکھوں میں بھرنا کس لئے

یار یہ بس شعر ہیں کُرسی وغیرہ کچھ نہیں
شاعری سُن حظ اُٹھا بے کار جلنا کس لئے

ق

اپنی حد میں رہ نذیر آزاد! تھوڑی شرم کر
ہر ہمکتی شاخِ گُل پر ہمکنا کس لئے

سُن نذیر آزاد! کوئی کام تو کر ڈھنگ کا
شعر کی وادی میں ایسے ہی بھٹکنا کِس لئے

ہاں نذیر آزاد! اپنے ساتھ بھی کچھ دِن گزار
میڈیا، گھر، دوست، رشتے، اُف الجھنا کِس لئے

جا نذیر آزاد! سرتاپا حماقت اوڑھ لے
غور کرکے تِلملانا اور کُڑھنا کِس لئے





اور نزدیک آ پھِسل مجھ میں
ناؤ، مانجھی ہی کیا، ہے ڈل[1] مجھ میں

اِک ذرا تجھ سے بات کرنا تھی
ہاں یہاں تخلیہ ہے چل مجھ میں

اِک مصوّر ہے مجھ میں اَیں وَیں سا
ایک بُت گر ہے بے بدل مجھ میں

ایک افسانہ تھا، نہ چل پایا
راوی اس کی ہے اب غزل مجھ میں

ایک بوڑھا تھا مجھ میں، رات مرا
اچھّے بچوا! بہت مچل مجھ میں

منہ بسورے ہوئے ہے عمرِ رواں
پر بہت خوش ہے ایک پل مجھ میں

وہ بھی معصوم تھا نہ بچ پایا
وہ جو گھائل ہوا تھا کل مجھ میں

تو یقیں کر بُرا نہیں ہوں میں
ہاں یقیناً ہے کچھ خلل مجھ میں

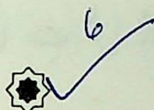
تیرا کیا کام! جاوٗ کافی ہیں
ایک دو کیا، کئی اجل مجھ میں

اپنے چھل کے خلاف لڑتا ہوں
شاید اتنا نہیں ہے بل مجھ میں

کج روی سے بہت گریزاں ہوں
یعنی سیدھی ہے کوئی کل مجھ میں



ل: کشمیر کی خوبصورت اور مشہور جھیل



پہلے غُبارِ کوچۂ دلدار ہو گئے
آخر پہ حِصّۂ درو دیوار ہو گئے

دیکھا وقارِ کوچۂ اہلِ منافقت
اپنے ہُنر سے برسرِ پیکار ہو گئے

لو اِس طرف سے کوئی بھی خدشہ نہیں رہا
شاملِ صفِ عدو میں سبھی یار ہو گئے

میری سزا کے حق میں ہر اک بُت فروش تھا
غفّاریانِ شہر بھی قہّار ہو گئے

جتنے بھی شوخ پھول تھے شاخِ کمال پر
سب نذرِ صاحبانِ طرح دار ہو گئے

تُم کیا ہماری وادیٔ جاں میں ہوئے طلوع
جتنے بھی زخم سوئے تھے بیدار ہو گئے





اُسے بھی میری کسی بات کا گِلہ ہُوا ہوگا
وہ ایک شخص جو خود سے نہیں جُڑا ہُوا ہوگا

گروہِ کج کُلہاں پہلے ہی سے تھا آمادہ
یہاں جو بِک نہ سکا ہو وہاں بِکا ہُوا ہوگا

جو چُپ ہوں میں تو نہ صاحب سمجھ مرض ہے یہ کوئی
میرے گلے میں ترا جھوٹ ہی پھنسا ہُوا ہوگا

جو مجھ کو روز ہر اک بد دعا میں رکھتا ہے اب
وہ میرے لب پہ کسی رات میں دُعا ہُوا ہوگا

جو مجھ کو قید کرا کے مٹھائی بانٹ رہا ہے
ضرور میری سفارش پہ ہی رِہا ہُوا ہوگا

ہر ایک بات پہ وہ پہلے سوچتا ہے بہت کچھ
سو اُس نے عشق یہ سوچا تو مبتلا ہُوا ہوگا





وہ بدن چشمِ گنہگار میں کیسے آئے
نہ سہی، حلقۂ گفتار میں کیسے آئے

ہم تو صحرا میں بھٹکتے تھے بڑی شان کے ساتھ
یک بہ یک موت کے بازار میں کیسے آئے

اتنے زخموں کے دہن شور مچاتے ہیں بہت
بے زبانی ترے بیمار میں کیسے آئے

موجِ تنہائی فزوں تر ہے کنارِ دِل سے
جوشِ غم دھیمی سی رفتار میں کیسے آئے

اپنی نظروں سے بھی رہتے تھے ہمیشہ اوجھل
کیا پتہ چشمِ خریدار میں کیسے آئے

بعد مُدت یہ اچانک ہی پرندوں پہ کھُلا
کب، کہاں، نرغۂ عیّار میں کیسے آئے

یوں تو ہر ایک تمنّا تھی مُقفّل دِل میں
چور دِل کے، درِ اظہار میں کیسے آئے

عشق بن کر ترے کوچے میں تھے بکھرے لیکن
اس ہوس کی چُنی دیوار میں کیسے آئے





آشنائی گر نہیں نا آشنائی رہ گئی
موسمِ گم گشتہ کی کچھ تو نشانی رہ گئی

ذکر چھیڑا تھا تری آنکھوں کا کل کس بوند نے
رات کاجل کے سمندر میں نہاتی رہ گئی

زمہریری بادِ غم یا چلچلاتا ہجر ہو
تیری خوشبو دشتِ دل میں لہلہاتی رہ گئی

خواہشیں ترغیب دیتی تھیں ہوس کے بام سے
صاحبوں کی بے نیازی وے نیازی رہ گئی

جھوٹ کے مُنہ میں دلیلیں تھیں فصاحت میں بسی
میری آنکھوں میں بسی سچی گواہی رہ گئی

تو نے آئینے کے دل سے تو چھڑایا آپ کو
سطحِ آئینہ پہ تیری زخم کاری رہ گئی

ہم نے رو رو کر خداؤں کو پُکارا تھا بہت
سر بہ زانو سوچتی ساری خدائی رہ گئی





راستہ واسطہ نہیں کوئی
رہنما وہنما نہیں کوئی

ہاں مجھے بھی وہ جانتا ہے مگر
ماجرا واجرا نہیں کوئی

دائرے وائرے ہیں سب بکواس
سِلسلہ وِلسلہ نہیں کوئی

تشنہ دہنو بہت پیو، آگے
میکدہ ویکدہ نہیں کوئی

کس کو اب تک دِکھایا سچ اس نے
آئینہ وائینہ نہیں کوئی

چاہیئے کیا تجھے بتا کھُل کر
چونچلہ وونچلہ نہیں کوئی

یہ قصیدے وصیدے چھوڑ میاں
فائدہ وائدہ نہیں کوئی

قیسؔ و فرہادؔ کا زمانہ گیا
اِلتجا وِلتجا نہیں کوئی

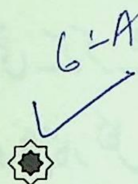
حُسن میں حُسن پن ہی جب نہ رہا
دِل جلا وِل جلا نہیں کوئی

بس ارادہ ہے عشق میں منزل
فاصلہ واصلہ نہیں کوئی

میرے حصے کی دھوپ دے بھائی
مشورہ وشورہ نہیں کوئی

سانحے میں ہی مرگیا آزاد
غُلغلہ وُلغلہ نہیں کوئی





بعد میں دشت بھی بازار نکل آتے ہیں
سب مری جاں کے خریدار نکل آتے ہیں

داستاں طول نہ کھینچے یہی چاہا تھا مگر
پسِ کردار بھی کردار نکل آتے ہیں

میرے غم خانے کا سیّاح بنا ہے ہر شخص
روز و شب نِت نئے غم خوار نکل آتے ہیں

جی میں آتا ہے کہ گھر چھوڑ کے جنگل میں رہیں
در و دیوار سے خوں خوار نکل آتے ہیں

یہ مرے خون کی شوخی کے کرشمے ہیں میاں
ایک سے ایک جو شہکار نکل آتے ہیں

اے مری سہل پسندی تجھے سمجھے گا خدا
جو بھی آسان ہیں دشوار نکل آتے ہیں

کاش ہوتے جو بھرت مُنّی دکھاتے اُن کو
اپنی مٹی سے اداکار نکل آتے ہیں

التباس ایسا کہ آزاؔد بہ ظاہر ہیں جو
وہ حقیقت میں گرفتار نکل آتے ہیں





صحرائے خموشی کی گفتار بنوں یا نہ
سہمی ہوئی آہوں کی رفتار بنوں یا نہ

خوشبوئے بیابانی! رستہ ہوں مگر دشوار
کیا تیرے گزرنے کو ہموار بنوں یا نہ

عیّار زمانہ ہے، بتلا میں تری خاطر
کیا ڈھال بنوں یا پھر تلوار بنوں یا نہ

انکار مری فطرت انکار ہی عادت ہے
دے حکم سراپا میں انکار بنوں یا نہ

شفّاف تو ہے لیکن آئینہ نہیں ہے تُو
تکمیل تری ہوگی زنگار بنوں یا نہ

ہے شوق بہت میں بھی افسانے میں جا بیٹھوں
تُو جانچ ذرا مجھ کو کردار بنوں یا نہ

تب تُو بھی سمجھ پائے کیا عالمِ فانی ہے
مضبوط حویلی سے آثار بنوں یا نہ





سُنو! خود کو جلانا ہے کہ دُنیا کو جلانا ہے
یہی تیرا نشانہ ہے یہی میرا نشانہ ہے

فقط مجھ سے نہیں گر پائے گی یہ جسم کی دیوار
تجھے واں سے گرانا ہے مجھے یاں سے گرانا ہے

چلو یادوں کے گھر میں ڈھونڈ لیں ہم اپنا ماضی، پھر
تجھے آدھا چُرانا ہے مجھے آدھا چُرانا ہے

بتا! تجھ کو خبر کیا آسماں کے فیصلے کی ہے
اُسے تجھ کو مٹانا ہے اُسے مجھ کو مٹانا ہے

ہوا ہے اتفاقِ رائے پنچایت میں اپنے تئیں
تجھے بھی باز آنا ہے مجھے بھی باز آنا ہے

چلو بازار سے ہم بھی نئے چہرے خریدیں گے
تمہارا بھی پُرانا ہے ہمارا بھی پُرانا ہے

"پڑوسی کیا کہیں گے" کھلبلی عشّاق میں ہے، سو
یہی تیرا بہانہ ہے یہی میرا بہانہ ہے

اداکاری ہے واحد راستہ رشتوں کے آخر میں
تجھے مجھ کو منانا ہے مجھے تُجھ کو منانا ہے

ذرا دیکھیں کہ لہجوں کی مشینوں میں نہیں گڑبڑ
ترا بھی واعظانہ ہے مرا بھی واعظانہ ہے





یہ جو ہیہات ہے سائیں
مری اوقات ہے سائیں

کہا کِس نے کہ یہ ہے عشق
پلٹ آ گھات ہے سائیں

وہ جس سے ڈر رہے ہیں ہم
وہی کیا رات ہے سائیں

گلے ملتی ہے یہ دُنیا
مگر بدذات ہے سائیں

تُجھے بھی عشق ہے مجھ سے
ارے کیا بات ہے سائیں

کبھی رِم جھم ہے مجھ سے ہی
کبھی برسات ہے سائیں

گدا گر دِل تک آ پہنچے
یہ کیا خیرات ہے سائیں

اسے کہتے ہو بِندرابن
یہ تو گجرات ہے سائیں





سایہ ہوں میں نہ سائباں ہوں میں
دھوپ کی زد پہ آسماں ہوں میں

بات تجھ تک پہنچ نہ پائے گی
عہدِ وارفتہ کی زباں ہوں میں

میرا اِک لفظ بھی نہیں اس میں
ایسے ویسوں کی داستاں ہوں میں

دیکھتے ہیں کہاں پھسل جاؤں
اپنی موجوں پہ خود رواں ہوں میں

دل کے محور پہ میری گردش ہے
سو، ذرا دیکھ آ کہاں ہوں میں

اب پس و پیش کیا ہے گاہک جی
مفت میں لے کہ نقدِ جاں ہوں میں

جس کی تعبیر میں ہے وقت ابھی
تجھ پہ نازل وہ چیستاں ہوں میں

ذرہّ ذرہّ مرا ہے مُشک بہ جاں
تودۂ کوئے گل رُخاں ہوں میں

موسمِ زمہریر کے در پر
غنچۂ شاخِ زعفراں ہوں میں





سیاست ہے سو ہے میری بلا سے
یہ خدمت ہے سو ہے میری بلا سے

مری رسوائی ہے یا نیک نامی
جو شہرت ہے سو ہے میری بلا سے

حریصِ شہر گو ہاتھوں میں تیرے
قیادت ہے سو ہے میری بلا سے

اسی میں تجھ کو آخر ڈوبنا ہے
رعونت ہے سو ہے میری بلا سے

سِمٹ کر گھٹ گئی اک سابقہ وہ
سیادت ہے سو ہے میری بلا سے

میسّر ساگ چاول ہے مجھے، پھر
معیشت ہے سو ہے میری بلا سے

اُسی کا ہوں میں باغی جو کہ تیری
بغاوت ہے سو ہے میری بلا سے

شرارت ہے نہ خوشبو نے حرارت
صباحت ہے سو ہے میری بلا سے

جو دِل میں ہے اُسی سے ڈر رہے ہو
فصاحت ہے سو ہے میری بلا سے

نزول اِس کا جو مجھ پر ہو تو جانوں
قیامت ہے سو ہے میری بلا سے

نذیر آزاد تیرے جسم و جاں میں
محبت ہے سو ہے میری بلا سے





لازماً اُس جگہ دِیا ہوگا
پر یقیناً وہ بُجھ چُکا ہوگا

ایک بستی تھی گُم ہوئی ہوگی
ایک دریا اُچھل پڑا ہوگا

گُل بدن ہوگی قیدِ افسوں میں
دیو اب رقص کر رہا ہوگا

آگ جنگل میں پھر بھڑک اُٹھی
کیا پتہ کون اب جلا ہوگا

وقت کے بے کراں سمندر میں
کوئی لمحہ پھِسل گیا ہوگا

میرے اندر کے کُرک شیتر میں
جنگ کا طبل بج چکا ہوگا

تیرگی شب کی بھانپ کر سورج
پھر سے سونے کی سوچتا ہوگا

عرش کی لامکانیوں سے خدا
فرش والوں کو گھورتا ہوگا

تیرا دِل لے کے کیا کروں صاحب
یہ بھی تجھ سا ہی کھوکھلا ہوگا

یہ جو گڑیا ہے تیرے پہلو میں
اس کا بھی نام بی وفا ہوگا

ڈھونڈتے ڈھونڈتے نذیر آزاد
بیتی رُت کی طرف مُڑا ہوگا





دشت و صحرا کو ابھی سے کھودنا اچھا نہیں
اور سُنو! یوں آسماں کو توڑنا اچھا نہیں

کارو بارِ زیست میں کتنا خسارہ ہو گیا
ایسے گھٹیا مسئلے پر سوچنا اچھا نہیں

عشق ہو، دیوانگی ہو، خاکساری یا کہ غم
ذات کی سرحد کو ہر جا پھاندنا اچھا نہیں

لاکھ کوشش تم کرو، آگے ہی بڑھتے جائیں گے
ان پرندوں کے پروں کو موڑنا اچھا نہیں

پھر بھی کچھ قطرے بچانے تھے جولائی کیلئے
موسمِ گُل! اس قدر دل کھولنا اچھا نہیں

گرمیٔ نظارگی سے یہ پگھل ہی جائیں گے
موم کے پُتلوں کو ایسے تاڑنا اچھا نہیں

سو رہے ہیں جو کہ ہریالی پہ ماضی اوڑھ کر
وہ بِپھر جائیں گے ان کو چھیڑنا اچھا نہیں





کچھ تو گزشتہ تھا میرا
روز جو مرتا تھا میرا

جب یہ سڑکیں بنی نہ تھیں
واحد رستہ تھا میرا

اُول جلول کی دولت سے
بھاری بستہ تھا میرا

یاد ہے ایسا وقت بھی تھا
تُو جب سُنتا تھا میرا

رات کو شہر سے کافی دور
گاؤں بستا تھا میرا

اک بوڑھے کی صدری میں
ہاتھ بھٹکتا تھا میرا

اک بُڑھیا سے لڑنے میں
بالک تھکتا تھا میرا

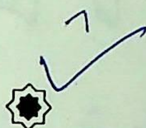
ابے تبے کے میٹھے بول
کوئی چہکتا تھا میرا

جب تک تُجھ میں سَنتا* تھا
زندہ بَنتا* تھا میرا

کسی کُمہار سے جُڑ نہ سکا
خواب شکستہ تھا میرا



*: سنتا بنتا (پنجابی لطائف کے دو بیوقوف کردار)



دشت در دشت ہمیں دیکھ یہاں ہیں ہم لوگ
کارواں ہیں تو نہیں ریگ بجاں ہیں ہم لوگ

اپنے ماضی سے خفا اور ہیں بیزارِ پگاہ
قیدِ امروز کے شوریدہ سراں ہیں ہم لوگ

دیکھ اوقات میں رہ اپنی صدی کی شورش
تو زمانے سے ہے اور وجہ زماں ہیں ہم لوگ

ذائقہ منہ کا بدلنے کو قصیدے بھی کہے
ورنہ عادت سے فقط مرثیہ خواں ہیں ہم لوگ

زہر میں ڈوبی ہوئی اوس سے لب بستہ رہے
شاخۂ وقت پہ کچھ غنچہ لباں ہیں ہم لوگ

یہ جو سرپوش ہے، لاریب کرایہ کا ہے
مجلسِ دہر میں یوں کج کلہاں ہیں ہم لوگ

وقت کی راہ پہ ناپید اصولوں کے قدم
جو کبھی پڑ نہ سکے اُن کے نشاں ہیں ہم لوگ

شہر آشوب کبھی لکھنے کو دِل چاہے اگر
تو یہ لکھتے ہیں کہ آشوب جہاں ہیں ہم لوگ

تم نہ باز آؤ گے آزاد اب اس بڑبڑ سے
کون، کب، کتنے، کدھر، کیسے، کہاں ہیں ہم لوگ





بے بسی، دل زدگی خوب اداکاری ہے
بے خبر ہم کو پھنسا دینے کی تیاری ہے

یاد میں اب بھی دریچہ ہے وہ روشن یعنی
آنکھ زندہ ہے ابھی خون میں سرشاری ہے

جب سے تو حال مرا پوچھنے آیا ہوا ہے
میرے ہونٹوں پہ اُسی دم سے ہنسی جاری ہے

تم محبت میں سیاست سے نہیں باز آئے
اور ہم بول نہ پائے کہ یہ عیّاری ہے

اس کی عزت نہ کروگے تو کروگے کیا پھر
صاحبو! ضرب جو اس کی ہے، بڑی کاری ہے

میں ہوں شمشیر بکف مدِّ مقابل اپنے
سر رہے یا نہ رہے سر میں تو سرداری ہے

تیرے ہاتھوں سے بہت دور ہیں میٹھے انگور
یہ فقیری نہیں آزاد یہ لاچاری ہے





بے بسی، دل زدگی خوب اداکاری ہے
بے خبر ہم کو پھنسا دینے کی تیاری ہے

یاد میں اب بھی دریچہ ہے وہ روشن یعنی
آنکھ زندہ ہے ابھی خون میں سرشاری ہے

جب سے تو حال مرا پوچھنے آیا ہوا ہے
میرے ہونٹوں پہ اُسی دم سے ہنسی جاری ہے

تم محبت میں سیاست سے نہیں باز آئے
اور ہم بول نہ پائے کہ یہ عیاری ہے

اس کی عزت نہ کرو گے تو کرو گے کیا پھر
صاحبو! ضرب جو اس کی ہے، بڑی کاری ہے

میں ہوں شمشیر بکف مدِّ مقابل اپنے
سر رہے یا نہ رہے سر میں تو سرداری ہے

تیرے ہاتھوں سے بہت دور ہیں میٹھے انگور
یہ فقیری نہیں آزؔاد یہ لاچاری ہے





کس کے ہیں یہ خواب کئی
آنکھیں ہیں پُر آب کئی

تاریخ اپنی تھی مکمّل
چوری ہوئے ابواب کئی

تیرے سوالوں کا نرغہ
جس میں پھنسے ہیں جواب کئی

اس بستی میں اور بھی ہیں
ہم سے خانہ خراب کئی

آئے، بیٹھے، چلے گئے
پلکوں پر مہتاب کئی

صحرا کے سُر تال کے بعد
رقص میں ہیں گرداب کئی

دادا جان کے ساتھ ہیں دفن
آداب و القاب کئی

کندہ ہیں مرقد پہ ابھی
مرنے کے اسباب کئی

بچّو کتاب میں لکھّا ہے
جمعِ ربّ ارباب کئی



کس کے ہیں یہ خواب کئی
آنکھیں ہیں پُر آب کئی

تاریخ اپنی تھی مکمّل
چوری ہوئے ابواب کئی

تیرے سوالوں کا نرغہ
جس میں پھنسے ہیں جواب کئی

اس بستی میں اور بھی ہیں
ہم سے خانہ خراب کئی

آئے، بیٹھے، چلے گئے
پلکوں پر مہتاب کئی

صحرا کے سُر تال کے بعد
رقص میں ہیں گرداب کئی

دادا جان کے ساتھ ہیں دفن
آداب و القاب کئی

کندہ ہیں مرقد پہ ابھی
مرنے کے اسباب کئی

بچّو کتاب میں لکھّا ہے
جمعِ ربّ ارباب کئی

تیرے میرے بیچ میں ہیں
جہلم کئی چناب کئی

مست ملنگ اب نیند سے جاگ
آنکھیں دو ہیں خواب کئی

میرے شہر میں واقع ہیں
گیلان و اندراب کئی





دل کی دھوپ میں جلتا رہتا ہوں
ٹھنڈی باتیں کرتا رہتا ہوں

سبز سفیدے گرتے جاتے ہیں
سوکھا پتّہ ہلتا رہتا ہوں

جھونکا بھر ہی یاد کا داخل ہو
کھڑکی کھول کے بیٹھا رہتا ہوں

غم کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے
بھور بھئے تک سوتا رہتا ہوں

سب دھندوں میں جان گنوانے پر
گورکھ ناتھ اب جپتا رہتا ہوں

آنکھوں آنکھوں میں کٹتی ہے رات
دن بھر نیند میں چلتا رہتا ہوں

جو دروازے خود پر بند کیئے
ان کو اکثر تکتا رہتا ہوں

کن ہاتھوں میں وقت کا چابک ہے
میں کیوں ضربیں سہتا رہتا ہوں

روز اک نقشِ قدم پڑ جاتا ہے
نقشہ بنتا جاتا رہتا ہوں





فہم کا بوجھ اٹھانے والا میں
جہل تلے دب جانے والا میں

رات کو گلیاں چھانتا پھرتا ہوں
شام پڑے گھر جانے والا میں

مہر بہ لب ہوں پھانس گلے میں ہے
بات سے بات بنانے والا میں

خود کو ہی اب عریاں کرنا پڑا
سب کے راز چھپانے والا میں

بادِ خزاں کی نذر بھی ہوسکتا
پھولوں کو مہکانے والا میں

دل کے صحرا میں بیٹھا ہوا ہوں
عشق کی ناو چلانے والا میں

راکھ سمیٹوں یا خود شعلہ بنوں
گھر کی آگ بجھانے والا میں

اپنی قبر کو کھود رہا ہوں اب
مردے روز جگانے والا میں





یہ جو کشمیر سے محبت ہے
تیری تصویر سے محبت ہے

یہ جو تصویر سے محبت ہے
عکسِ دلگیر سے محبت ہے

بول کیا تیر سے محبت ہے
یا کہ نخچیر سے محبت ہے

جنّتِ ارض کے مکینوں کو
جرم و تعزیر سے محبت ہے

بادِ خزاں کی نذر بھی ہوسکتا
پھولوں کو مہکانے والا میں

دل کے صحرا میں بیٹھا ہوا ہوں
عشق کی ناو چلانے والا میں

راکھ سمیٹوں یا خود شعلہ بنوں
گھر کی آگ بجھانے والا میں

اپنی قبر کو کھود رہا ہوں اب
مردے روز جگانے والا میں





یہ جو کشمیر سے محبت ہے
تیری تصویر سے محبت ہے

یہ جو تصویر سے محبت ہے
عکسِ دلگیر سے محبت ہے

بول کیا تیر سے محبت ہے
یا کہ نخچیر سے محبت ہے

جنّتِ ارض کے مکینوں کو
جرم و تعزیر سے محبت ہے

وہ لہو میرا انگلیوں پہ لگائیں
جن کو تشہیر سے محبت ہے

تو بھی دشنام پر اُتر، مجھ کو
حرفِ تحقیر سے محبت ہے

حرفِ حق ہو ترا تو ہو، مجھ کو
اپنی تقصیر سے محبت ہے

بات کہنے کو خوب ہے تم کو
غالبؔ و میرؔ سے محبت ہے

دو غلا پن نہیں تو کیا آزادؔ
تجھ کو زنجیر سے محبت ہے





ہواؤں کے بہکنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے
گلوں کے ہاتھ ملنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے

بڑے پیچیدہ رستوں سے، مری جاں، ہو کے آیا ہوں
تری زلفیں بکھرنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے

بچھڑ کر تجھ سے، ملنا اور سے موقوف کر ڈالا
اجی خود سے بھی ملنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے

مری چہروں کو پڑھنے کی مہارت واجبی سی ہے
کسی چہرے کو پڑھنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے

تجھے کچھ آسماں کے پار جا کر ہو خوشی، مجھ کو
زمیں پر پاؤں دھرنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے

تجھے کچھ فرق پڑتا ہو نہ پڑتا ہو، مجھے اکثر
لہوراہوں میں رَلنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے





یہی ہے راہ فقط تا وہ کچھ جلائیں نہیں
کہ شہرِ آتش و آہن میں گھر بسائیں نہیں

وہ راز جو کہ ہمیں جان سے بھی پیارا ہے
وہ راز مر کے کسی کو بھی ہم بتائیں نہیں

تمہاری راہ میں اب نہر خون جاری ہے
سو ہم بھی کشتیِ جاں اس طرف بڑھائیں نہیں

سُنا ہے شہرِ جنوں میں نہیں ہے شور کہیں
تمام بخیہ گراں واپس آئیں، آئیں نہیں

سنانِ وتیغ کی سب آب اُن سے جاری ہے
سولوگ پیاس کہیں اور اب بجھائیں نہیں

تو کیا یہی ہے ترا آخری عہد نامہ
پھر آئینے سے کبھی بھی نظر ملائیں نہیں





گلاب غم کا کھلے یا خوشی کا لالہ ہو
غزل کی شام ہو لب پر نہ کوئی تالا ہو

وہ جس کی تیرگی زلف سے ہے باقی شام
اُسی کی روشنیٔ طبع سے اُجالا ہو

جوازِ در بدری اُن سے مانگتے ہو کیا
جنہوں نے کوہکن و قیس تک کو پالا ہو

بجا ہے تہمتِ جور و جفا اگر ہم نے
تمہارا تیر دِل و جان سے نکالا ہو

اُسے بھی عشق کا ساحل گلے لگائے گا
وہ جس کو موجِ غمِ دہر نے اچھالا ہو

بنامِ بختِ رقیباں اٹھائیں جام ضرور
مگر یہ شرط ہے آزاد ہم پیالہ ہو





کیا وہ محشر تھا کہ تھی وہ جلوہ آرائی کہ اُف
خیرہ ہیں آنکھیں کہ جانے کو ہے بینائی کہ اُف

دربدر پھرتا رہا لے کر گھٹن سی آگہی
پھر اچانک تیرے کوچے کی ہوا آئی کہ اُف

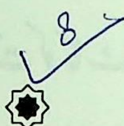
دشتِ دِل اک عمر سے تھا تشنۂ نیساں بہت
ایسے میں کب تیری زلفوں کی گھٹا چھائی کہ اُف

الحذر! اک عہد تھا عہدِ جنوں ایسا کہ بس
الاماں! اک دور ہے دورِ شکیبائی کہ اُف

کل تلک دِل کی حویلی میں بھی تھیں رعنائیاں
اتنی بے دردی سے کس نے رات میں ڈھائی کہ اُف

میں ابھی اُبھرا ہی تھا اُس چشمِ نم کی جھیل سے
اور پھر ڈوبا جو لے لی اُس نے انگڑائی کہ اُف





یہ روشنی میں جو تھوڑا خلل پڑا ہوا ہے
چراغِ جاں سے یہ میرے دھواں اُٹھا ہوا ہے

دلِ تباہ کی اب مُستجاب ہو بھی دُعا
ترے حضور میں کب سے یونہی جھکا ہوا ہے

کنار و آب کی تفریق پھر نہیں رہتی
حذر! کہ یاد کا دریا ابھی تھما ہوا ہے

ابھی ہے آتشِ سوازں کی وہ عملداری
تمہارے ذِکر کا سورج ابھی رُکا ہوا ہے

ابھی سے تارِ رفاقت کو کاٹ دیتے ہو
کوئی بدن سے مرا سلسلہ جُدا ہوا ہے

یہیں سے اذنِ سفر عشق میں ملا تھا ہمیں
یہیں سے راستہ اک اور بھی جڑا ہوا ہے

ذرا سی دیر کو ستائے گا یہ رہروِ دل
سفر میں دھول بھی تھی اور کچھ تھکا ہوا ہے

''ہوا تھا یوں کہ اک عاشق تھا اور تھی دُنیا''
''چلو ہٹاؤ یہ قصّہ بہت سُنا ہوا ہے''





جو کاروانِ خراباں ابھی روا نہ ہُوا ہے
الگ کیا ہے مجھے بس یہی روا نہ ہُوا ہے

پڑی شعاعِ رُخِ جاں فزا بہار کا سایہ
کھِلا جو غنچۂ لب موسم عاشقانہ ہُوا ہے

پڑا ہے در پہ ترے جو ہجوم دل زدگاں کا
بنا ہُوا ہے خدا تو مگر خدا نہ ہُوا ہے

ابھی رواں ہے مرے خوں میں موجِ مہرِ بُتاں یار
مرا خرابۂ دِل جو نگار خانہ ہُوا ہے

نیا لباس پہن کر جو ہم نے بال بنائے
بس اتنی بات کا اتنا بڑا فسانہ ہُوا ہے

نہ سہہ سکوں گا مسلسل عذاب مرگِ ضمیر اب
قیام دار سے پہلے بھی اک زمانہ ہُوا ہے





اُجڑے ہوئے گلشن میں صبا تک نہیں آتی
اِس شہرِ خموشاں میں قضا تک نہیں آتی

نے شورشِ زنجیر نہ آہنگِ فُغاں ہے
اِمسال قفس سے تو صدا تک نہیں آتی

خوشبو تری سانسوں کی جہاں ناچ رہی تھی
اُس کمرے میں تھوڑی سی ہوا تک نہیں آتی

کیا تشنہ لبی میری بھی منظور ہوئی ہے
کیوں اپنی طرف موجِ بلا تک نہیں آتی

ملتی نہیں کیا ناز و ادا کی کوئی خیرات
بستی میں تو آوازِ گدا تک نہیں آتی



نیا لباس پہن کر جو ہم نے بال بنائے
بس اتنی بات کا اتنا بڑا فسانہ ہُوا ہے

نہ سہہ سکوں گا مسلسل عذاب مرگِ ضمیر اب
قیامِ دار سے پہلے بھی اک زمانہ ہُوا ہے





اُجڑے ہوئے گلشن میں صبا تک نہیں آتی
اِس شہرِ خموشاں میں قضا تک نہیں آتی

نے شورشِ زنجیر نہ آہنگِ فُغاں ہے
اِمسال قفس سے تو صدا تک نہیں آتی

خوشبو تری سانسوں کی جہاں ناچ رہی تھی
اُس کمرے میں تھوڑی سی ہوا تک نہیں آتی

کیا تشنہ لبی میری بھی منظور ہوئی ہے
کیوں اپنی طرف موجِ بلا تک نہیں آتی

ملتی نہیں کیا ناز و ادا کی کوئی خیرات
بستی میں تو آوازِ گدا تک نہیں آتی





کچھ دین یا دُنیا کے مشاغل تو نہیں تھے
جس وقت محبت کے مسائل تو نہیں تھے

اس بار بھی ہم ہار کا منہ دیکھ کے آئے
اس بار بھی ہم دوڑ میں شامل تو نہیں تھے

ہم اپنے تصّور کی سزا کاٹ چکے ہیں
تھے قید میں پابندِ سلاسل تو نہیں تھے

میں جنگ کے میداں سے ابھی لوٹ رہا ہوں
دشمن کہ مرے مدِّ مقابل تو نہیں تھے

دِل ایسا ہی کچھ مسئلہ تھا میرے وطن کا
گو آس نہ تھی پر کہیں بے دِل تو نہیں تھے





کتنے برسوں بعد دکھایا دِل نے وہ بچپن کا چاند
اُجلا امّاں کی چادر سا ابا کی داڑھی سا چاند

شام کو گاؤں کے ٹیلے پر رات کو میرے آنگن میں
شاید اب تک گاتا ہوگا میری دُھن میں تنہا چاند

سیبوں کی شاخوں میں رہ کر چین سے سویا کرتا تھا
بنگلے کی چھت پر آکر کیوں رہتا ہے اب اکھڑا چاند

کیا موسم نے کروٹ بدلی کیسی فصلیں اُگ آئیں
میرے من میں کالا سورج تیرے رُخ پر پیلا چاند

مدت سے رشتوں کے محور پر وہ گردش کرتا ہے
چرخے والی امّاں کا ہے بھائی اپنا ماما چاند

میری کتابوں کے بستے کا کونا کونا چھانو تو
اُس میں اب بھی رہتا ہوگا دادی کا وہ بھولا چاند





کسی کو شام ڈھلے انتظار کس کا تھا
کسی کی آنکھ میں شامل خمار کس کا تھا

حدودِ دشت سے آگے تھا میرا سناٹا
محیط ارض و سما پر غبار کس کا تھا

گلاب تیری نظر کے کھلے تھے دِل میں مرے
اُگا ہوا ترے پہلو میں خار کس کا تھا

کسی کی گردِ فسردہ میں بے کس و تنہا
وہ ایک قافلۂ اعتبار کس کا تھا

وصال و ہجر ترے ہاتھ میں تو ہے اب بھی
طلوعِ درد پہ پھر اختیار کس کا تھا





گھر سے ہم جب بھی نکلتے ہیں گداؤں کی طرح
وہ کسی موڑ پہ ملتے ہیں خداؤں کی طرح

یک بہ یک اُٹھتے ہیں پُرشور ہواؤں کی طرح
یک بہ یک چھپتے ہیں تاریک گھپاؤں کی طرح

ہم نے اُس طرزِ گدائی کو کیا ہے ایجاد
خود سے بھی ملتے ہیں ہم لوگ گداؤں کی طرح

وہ کبھی وقت کی مانند ہر اک سمت میں تھا
اب یہ عالم ہے کہ اوجھل ہے دِشاؤں کی طرح

ہم فرامینِ شہنشاہ کہ دربار سے دور
کُو بہ کُو پھرتے ہیں آوارہ نداؤں کی طرح

میرے صحرائے معانی کے وہ رم خوردہ غزال
کیوں بھٹک جاتے ہیں گُم گشتہ صداؤں کی طرح





(بیادِ ڈاکٹر فریدؔ پربتی)

ہر نئی سمت کی خاطر تھا مچلنے والا
اک نئی سیر کو جاتا ہے بچھڑنے والا

سوگیا آج سرِ شام تھکن کے باعث
گفتگو چاند سے ہر رات میں کرنے والا

دور اُفق پار کسی عالمِ امکاں سے پرے
جانے کِس دیس چلا راہ بدلنے والا

آپ اپنے سے بڑی شان سے گزرا ہوگا
دشت و صحرا و چمن سے وہ گزرنے والا

قطرہ قطرہ مری آنکھوں سے رواں ہوتا ہے
ابرِ تر بن کے دِل و جاں پہ برسنے والا





دِل میں کچھ کھلبلی سی رہتی ہے
جسم میں زندگی سی رہتی ہے

یاد کے زرد و سرخ پھولوں پر
رات بھر تازگی سی رہتی ہے

ہجر ہو یا وصال کا موسم
دل میں اک بے کلی سی رہتی ہے

عشق کی شاہراہ صدیوں سے
کیا کریں کھردری سی رہتی ہے

کوئی دِل میں مرے رہے نہ رہے
ایک تیری کمی سی رہتی ہے

ہر دیے کی چمک کے پہلو میں
اک ذرا تیرگی سی رہتی ہے

کیسے سو پائے گا نذیرآزاد
کوئی محفل جمی سی رہتی ہے





صبحِ فردا کی صدائیں بھی سُنا کرتے ہیں
ہم جو ماضی کے شبستاں میں رہا کرتے ہیں

تیرے بچپن کے بغیچے سے جو اُڑ کر بھاگے
وہ پرندے مری آنکھوں میں بسا کرتے ہیں

جو کہ خوابیدہ پسِ پردۂ امکاں ہیں ابھی
ایسی خوشیوں کا بھی ہرجانہ بھرا کرتے ہیں

ہم نے جب قیدِ تکلّف سے رہائی چاہی
وہ ہمیں قیدِ عناصر سے رہا کرتے ہیں

روز پیَروں سے جنہیں چُن کے نکالوں آزادؔ
رات پہلو میں وہی خار چُبھا کرتے ہیں





مانجھی چپو، ناو، کنارا چھوڑ دیا
جو بھی بھنور کو تھا نہ گوارا چھوڑ دیا

اپنے دِن پھر لوٹ کے آنے والے ہیں
پھر یاروں نے ساتھ ہمارا چھوڑ دیا

تب تب اِک دو تنکے بھڑ کے اور بُجھے
جب جب تم نے خس میں شرارہ چھوڑ دیا

اب تک سپنوں کی نگری میں ملتے تھے
یعنی تم نے ہم کو دوبارہ چھوڑ دیا

تیرا حکم تھا کچھ پھولوں سے دور رہوں
صاحب میں نے باغ ہی سارا چھوڑ دیا





بے منظری بازار کی ڈھلنے کے لئے ہے
ٹھہری ہوئی حالت بھی گزرنے کے لئے ہے

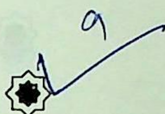
چمکے گا ترے دِل میں کبھی عشق کا سورج
ہونٹوں پہ جمی برف پگھلنے کے لئے ہے

رکھدی گئی ہے پاؤں میں لغزش بھی ہُنر سے
سینے میں ہے دِل اور مچلنے کے لئے ہے

جاناں! یہ ترا تیر، بتا، میرے جگر میں
رہنے کے لئے ہے کہ نکلنے کے لئے ہے

طوفان بھنور، موج بلاخیز ہے دریا
ساحل تو مری جان پھسلنے کے لئے ہے





دیکھنے کو دیدۂ برّاق رکھتا ہوں
ساتھ لیکن منظرِ سفّاک رکھتا ہوں

آسمانوں سے بہت میثاق رکھتا ہوں
خستگی سے یوں تو برسرِ خاک رکھتا ہوں

راحتوں کے سود کو بے باق رکھتا ہوں
گوشوارے رنج کے سب پاک رکھتا ہوں

اپنے پرکھوں سے یہی الحاق رکھتا ہوں
روز نیلامی پہ کچھ املاک رکھتا ہوں

اپنے گھر میں ایک ایسا طاق رکھتا ہوں
جس میں گزرے موسموں کی ڈاک رکھتا ہوں

گرچہ آنکھوں میں کئی آفاق رکھتا ہوں
دِل میں ذِکرِ صاحب لولاکؐ رکھتا ہوں





(بیادِ مرحوم سیّد رضا)

عدم کا باغ پئے مرگ لہلہاتا ہے
تمہارے نام کا اک پھول مسکراتا ہے

بہت کہا تھا سنبھل راستے میں پتھر ہیں
جو کوئی دوڑ کے جاتا ہے زخم کھاتا ہے

وہ ایک سبز پرندہ جو میرے گھر میں تھا
وہ روز صحن میں آتا ہے چہچہاتا ہے

رضا و صبر تو سیکھا تھا تم سے یار مگر
کسی کا چھوڑ کے جانا تو دِل دُکھاتا ہے

غمِ حسینؑ کو دِل میں بسا کے آیا تھا
غمِ حسینؑ کی تفسیر بن کے جاتا ہے





پھول کھلتے نہیں ہیں پانی کے
ہیں کرشمے لہو روانی کے

میرے گھر کے ہر ایک کونے میں
کتنے منظر ہیں لامکانی کے

میری باتوں پہ تیرا چُپ رہنا
سلسلے کیا ہیں بد گُمانی کے

میں ہوں، تو ہے، یہ نارسائی ہے
سب ہیں اسباب رائیگانی کے

تم خدائے سخن بنے پھرنا
معجزے ہیں یہ خوش بیانی کے




نظمیں

تاریخ کی نئی شاخ



ہوا کے ہاتھ میں
ایسی کوئی لکیر نہیں ہے
جو بتا سکے
کہ سورج کی دہکتی آنکھ میں
شبنم کی بوندیں
کب رقص کریں گی
رات کی تاریکی اوڑھے
چاند کے لب پر
کب تبسم کِھل اُٹھے گا

دھول میں اٹے ہوئے بے حرکت پیڑ
اپنی بے کسی پر کب رو پڑیں گے
کہ ان کے پتوں کا رنگ
(زرد یا سبز جو بھی ہو)
نظروں پر کھُل سکے

یہ جو کئی قرنوں کا دہکتا سناٹا
ہماری آتما میں گھُل گیا ہے
اس میں پھول، شبنم، خنجر اور کتاب
ایک جیسے دِکھائی دے رہے ہیں
اس کے پاگل دِن
بے ہنگم چلّاتے ہوئے
بے سمت دوڑتے چلے جا رہے ہیں

اسکی راتیں

چڑیلیں بن کر اپنے آپ کا پیچھا کر رہی ہیں

وقت کا بہاؤ شاید ہمارے پائیں باغ میں

کہیں تھم گیا ہے

یا ہمارے رسوئی گھر میں

پچھل پائی بن کر

اپنے بچوں کو کاٹ کاٹ کر

بھُن رہا ہے

ہر روز تاریخ سے نئی شاخیں پھوٹتی ہیں

جو مستقبل کی زرخیزی کے بجائے

ماضی کے کھنڈروں میں

پیوست ہو جاتی ہیں
ان کھنڈروں میں
حکمرانوں کی عیاشیوں
اور رسہ کشیوں کے پتھر ابھی موجود ہیں
لیکن لوگوں کا گارا
تاریخ کی آنکھوں سے
کب کا بہہ چُکا ہے
ہمارے سامنے ایسے آئینے دھرے گئے ہیں
جن میں ہمیں
اپنے چہرے تو نہیں دِکھائی دے رہے ہیں
باقی اشیاء تو ویسی ہی ہیں
جیسا کہ ان کو دِکھایا جا رہا ہے
یہ جو ہمیں اپنے چہرے دِکھائی نہیں دیتے ہیں

ممکن ہے کہ ہمارے چہرے ہی نہ ہوں
یا کسی عیّار نے
ہمارے سروں کو
جادوئی کہرے میں اوجھل کر کے رکھا ہو
یہ بھی ممکن ہے کہ
ہم کسی سائنس دان کی تجربہ گاہ میں ہوں
اور وہ تجربہ کر کے
ایک عظیم تھیوری سامنے لائے گا کہ
دماغ، بینائی، گویائی، بصارت
وغیرہ وغیرہ
کے بغیر بھی انسان انسان ہی
کہلائے گا (روبوٹ نہیں)
یہ بھی ممکن ہے کہ

ہم جو قرنوں کا سفر طے کر کے
ابھی نقطۂ آغاز پر ہیں
ہمیں معلوم نہیں
کہ ہم سے وہ آنکھیں
نوچ لی گئی ہیں جن میں
اشیاء کو صحیح حالت میں
دیکھنے کی صلاحیت
ہُوا کرتی تھی



محسوسات کی گداگری



میری معلوم تاریخ کا
ایسا بھی دور گزرا ہے
جب میں تیری خوشبو کو
اِن ہاتھوں سے پکڑ کر
اپنی جھولی میں بھرتا تھا
جب میں تیری گویائی کی کھنکتی اشرفیاں
اپنی سماعتوں کے خزانوں میں
ریکارڈ کرتا تھا
(فلم پی۔کے کے ہیرو نے بعد میں
مجھ سے یہ گُر سیکھا تھا)

یہ اُن دِنوں کی بات ہے
جب تیری بصارتیں
مجھے صبح کو دھوپ اور
رات کو چاندنی کے پیغام
بھیجا کرتی تھیں
(بعد میں لوگوں نے آنکھوں میں بسے
گڈ مارننگ اور دِل میں چھپے
گڈ نائٹ کے پیغام
وہاٹس اپ کے ذریعے
بھیجنا شروع کئے)
جب میں بادلوں پر سوار ہو کر
تیری لامکانی کی سیر کیا کرتا تھا
(معلوم ہو کہ اُس زمانے میں

خلائی تجربہ گاہیں نہیں بنی تھیں)

البتہ یہ سچ ہے کہ اُس دور میں
میرے گلے میں جوگ کی تھیلی
اور ہاتھ میں
جنون کی لاٹھی ہوا کرتی تھی
لیکن تب مجھ میں تیری محبتیں
بالیدہ ہو رہی تھیں
اور ابھی دبدبے کی فصل
تیار نہیں ہوئی تھی

اب جبکہ میں تیرے دبدبے کی
روٹی کھا رہا ہوں
میری جھولی میں چھید پڑ گئے ہیں

اور لاٹھی دیمک کے نشانے پر ہے
میں تیرے سامنے
پھر ایک بار
تیری خوشبوؤں، بصارتوں، سماعتوں،
ذائقوں اور گویائی
کی بھیک مانگ رہا ہوں



وقت کی پالکی پر سوار شہزادی



جب شام کے سُرمئی سائے
رینگتے رینگتے کالے ناگ بن جاتے ہیں
جب آسمان کی ننگی پیٹھ پر بیٹھا
برہنہ چاند
سیاہ گھنیرے بادلوں سے خود کو
ڈھانپ لیتا ہے
جب شبنم کا دِل
پھولوں کی آنکھوں سے
زار و قطار روتا ہے

جب تاریکیاں اپنے آپ کو
پرَت دَر پرَت اوڑھ کر
گہری نیند کے پالنے میں
سو جاتی ہیں
اور جب رات کا گڈریا
ستاروں کو ہانکتے ہانکتے
ہانپنے لگتا ہے
میرے دِل کی پُراسرار جھاڑیوں سے
تیری یاد کے ٹمٹماتے جگنو
سرسراتے ہوئے نکل آتے ہیں
اور ایک جگہ مل کر
نظموں کے الاؤ میں تبدیل ہوتے ہیں

اے وقت کی پالکی میں سوار شہزادی
اپنے تیز رفتار کہاروں کو
حکم دے کر روک
کہ ان کی رفتار کے آگے
موت کا سمندر ہے
جس کی لانہایتی کے سرے پر
فراموشی کا صحرا ہے
ایسا بے کراں صحرا
جو اپنی ریگِ رواں میں
ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے

اے وقت کی پالکی میں سوار شہزادی
اِس سے پہلے کہ تو

فراموشی کے بے کراں صحرا میں
دھنس کر اس کا رزق بن جائے
آ......میری نظموں کے الاؤ میں
بے خطر کود جا
تا کہ مستقبل کی کرنیں
تیرا استقبال کرسکیں



تن خمیدہ سوچ کی اُمیدیں



ہماری تن خمیدہ سوچ کے اُس پار
زہریلا مواد اوڑھی چوٹیاں
ہم پر کھولتے ہوئے قہقہے
انڈیل رہی ہیں
ہم نے اپنے ذہن کے تہہ خانے سے
اپنے مغز کا کچرا نکال کر
اپنے بازوؤں پر مڑھ دیا ہے
تا کہ ہمارے بازوؤں کی مچھلیاں
دیکھنے والوں کی سراسیمگی کو

اور گہرا کر سکیں

ہم نے اپنے ذہن کے تہہ خانے کو
اس امید پہ خالی کیا تھا
کہ اس میں سُنہری چونچ والی فاختائیں
آ آ کر علم و دانش کے انڈے
سینکا کریں گی

ہمیں کیا معلوم کہ کالے پر اور
سُنہری چونچ والی فاختائیں
کوہ ِندا کے اُس پار کی
اساطیری وادیوں میں
اپنا وجود تلاش کر رہی ہیں

ہمیں کیا معلوم
کہ ہم جو اپنے ذہن کے تہہ خانوں سے
جھاڑ جھنکاڑ صاف کر چلے ہیں
کہ ہمارے وجود کی چھت پر
اُجلی بر فیلی ہوائیں
منڈلا رہی ہیں

ہمیں کیا معلوم
کہ ذہن کے جس تہہ خانے کو
ہم نے خالی چھوڑ رکھا ہے
تاریخ کا ہر آنے والا موسم
اس میں نئی حماقتوں کی
بھرائی کرتا ہے

اور ہر جانے والا موسم

اس میں نئی حماقتوں کے بیج

چھوڑ جاتا ہے

اور ہم جو سمجھتے ہیں کہ

خالی تہہ خانے سے

علم و دانش کے چوزے نکلیں گے

ہر آنے والے موسم کا

بے صبری سے انتظار کرتے ہیں

لطف کی بات یہ ہے

کہ حماقتوں کی کھیتی میں

دانش کی فاختائیں

ڈھونڈتے ہوئے ہم

بدن کی پونجی لُٹا رہے ہیں



سلوٹیں



ہماری ذہانت کی پوشاک پر
سلوٹیں روز بہ روز گہری
ہوتی جارہی ہیں
لگتا ہے کہ بہت جلد ہم
فقط سِلوٹیں پہنے
سلوٹوں کا حِصہ بننے والے ہیں
ویسے ہماری ذہانت کی پوشاک
کے تانے بانے
کسی نادیدہ گھر یا دفتر یا ہوٹل کے

کسی تاریک تہہ خانے میں
بُنے جاتے ہیں
ہماری ذہانت کی پوشاک
جب بُن کر آتی ہے
تو بارشیں خوش ہو جاتی ہیں
کہ وہ آسانی سے اس پوشاک
کو تر بہ تر کریں گی
سورج زیرِ لب مسکراتا ہے
کہ اُسے
سوا نیزے پر آنے کی ضرورت نہیں
ان سلوٹوں کی خوبی ہے کہ
یہ اپنی پوشاک کو کس کر
اتنا تنگ کرتی ہیں

کہ پوشاک کی جگہ
سلوٹوں کا ڈھیر اُبھرتا ہے
جو معاذ اللہ
پہننے والے کی ستر پوشی
کے لئے بھی
ناکافی ہوتا ہے



یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں



ہمارے پُرکھوں کے قصّے
یا تو داستانوں سے ماخوذ تھے
یا اُجالے کے خواب

کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے
کہ رات کی رانی شبنم کی بوندوں سے
وضو کر کے دُعا مانگے ؟

چاند جھومر بن کر

کہیں کسی کے کانوں میں پڑا رہ سکتا ہے؟

یہ تو بالکل ناممکن ہے کہ
دن بھر کی تھکی ہوائیں شام کو
خوبانی کے پیڑوں پر سُستا سکیں!
کیا سیب کے شگوفے کہیں
دھوپ سے گفتگو کرتے ہیں؟

کس کو دِکھائی دیا کہ
سرمئی شام کے لبوں پر
شفق کی لالی جلوے دکھاتی تھی؟

چاند کیا دلہن ہے؟

جو نیلے آسمان کی سیج پر
گھونگھٹ کھولے؟

دن کا طویل راستہ کاٹ کر سورج
کہیں چنار کے سائے میں
اونگھتا رہ سکتا ہے؟

یہ تو عین ناممکن ہے
کہ سیہ راتیں
سبز و خوابوں کی سوغاتیں
بانٹتی پھریں

ارے توبہ

کہیں ہوائیں بھی بہتی ہیں
جن میں پرندے تیرتے پھریں؟
اور دریا اپنی روانی کے شور میں
کناروں کی باتیں سُن پائیں؟

چلو پل بھر کے لئے یہ سب مان لیتے ہیں
لیکن اس سے بڑا جھوٹ
کیا ہوسکتا ہے کہ
بچّے سچ مچ کے کھلونوں سے
کھیل پائیں
اور قبرستان
بستیوں سے دور رہ سکیں؟



جھنجھلاہٹ کا شرطیہ علاج



آج شہر میں پھر کرفیو لگا ہے
یا کسی نے ہڑتال کی کال دی ہے
ہاں کچھ نہ کچھ ہوا ہوگا
بجلی بھی چلی گئی ہے
اور انٹرنیٹ بھی بند ہے

کہاں کیا ہوا ہے
اس کی خبر نہیں
البتہ یہ معلوم ہے کہ

ہفتہ بھر کے ٹریفک کے بوجھ تلے
ہانپتی سڑکیں
بے ساختہ اونگھ رہی ہیں

شہر کے وسط میں
سڑک کے کنارے
کتّے لمبی تان کر سو رہے ہیں
اِکا دُکا کوئی گاڑی
(شاید ایمبولنس)
کبھی کبھی ان کی نیند میں
خلل ڈال رہی ہے

اسکول کے صحن میں

بوڑھا مالی

پیاسے نل کو بار بار کھول کر
سوکھی کیاریوں کو سینچنے کی
ناکام کوشش کر رہا ہے
شہر کے مضافات میں
بھکاریوں کے بچے
کھیلتے کھیلتے
باسی روٹی پر لڑنے لگے ہیں

دمّے کی مریض بُڑھیا
دردِ زہ میں مبتلا بیٹی کو
کھانستے ہوئے
حوصلہ دے رہی ہے

میرے گھر کے بچے لیپ ٹاپ پر
سُپائیڈر مین کی فتوحات
دیکھتے ہوئے تالیاں بجا رہے ہیں

میں نے اپنے گونگے بہرے
فون کو دیر تک گھورا
(شُکر ہے کہ بجلی آ گئی)
میں شہر کے حالات کی جانکاری کے لئے
ٹی۔وی۔ کے سامنے بیٹھ گیا
خبر نہیں چلو خبروں پر
دانشوروں کی بحث دیکھوں

لیکن یہ کیا

دانشوروں کی چیخ وپکار سے میں
مفہوم نکالنے میں کیوں ناکام ہوں

چلو ایسا کرتے ہیں
اپنے الجھتے اور بکھرتے خیالات کو
یہیں چھوڑ کر
اپنی رفیق تنہائی سے
بغل گیر ہوکر سو جائیں



اعترافِ شکست



لامتناہی نفی کے اندر
ایک گونجتی خودکلامی بھری تھی
یکا یک "کُن" کی آواز اُبھری
بے انت نہ ہونا لانہایت ہونے سے
معمور ہُوا
اطراف وجوانب نے پَل میں
باہیں کھولدیں
اور وقت نے اثبات کی کوکھ سے

جنم لے کر پہلی سانس لی
ستاروں نے آنکھیں میچتے ہوئے
خود کو دیکھا
اور پہلے حیران
پھر سراسیمہ ہو گئے
لانہایت اثبات کا کاسہ
دم بھر میں چھلک پڑا
آناً فاناً تشکیل کی ابتداء ہوئی
رفتار نے اپنے ہونے کا احساس کر کے
خود کو تقسیم کیا
اور بے رنگی کی کوکھ میں
ہزاروں رنگ اُبل پڑے
یکا یک خود کلامی

کلام میں تبدیل ہوئی
اور میری سماعتوں میں
مفہوم بن کر مہکنے لگی
''الست بربکُم''
''بلیٰ'' کہہ کر
میں نے اپنے نہ ہونے کی تصدیق کی

اے وہ جس نے دھوپ کو مسکرانا سکھایا
اے وہ جس نے چاندنی کا بدن تراشا
جس نے جنگلوں کی زلفوں میں خوشبو چھپائی
جس نے سمندر کو گہرائی
اور صحرا کو وسعت کی خلعت عطا کی
جس نے بارشوں کو نہانا سکھایا

اور جس نے زمین کی چھاتی میں
اپنی وحدت کی میخیں گاڑھ دیں
تو ہی میرا خالق ہے
تو ہی میرا مالک ہے
خوشبوئیں تجھ سے نکل کر
تیرا ہی تعاقب کرتی ہیں
پھول تُجھ سے نمو پا کر
تیرے ہی چرنوں میں
بھینٹ ہوتے ہیں
پہاڑوں کی بلندیاں
تیرا ہی استکبار لہراتی ہیں
اور سمندر کی پہنائیاں

تیری ہی بے پناہی گنگناتی ہیں

میں بھی تیرا یہ سر تیرا
سودا سر کے اندر تیرا
سجدوں میں تنویر بھی تیری
ہر تنویر میں منظر تیرا

اے وہ جس نے جہانوں میں
علم و دانش کو عرش کے سائے میں
تختِ زر فراہم کیا
جس نے عالموں کو
عالَموں کی حکمرانی پہ مامور کیا
مجھے اعتراف ہے کہ

تو نے قلم کی چونچ میں
میرے لئے رزق کی وسیع کھیتیاں رکھدیں
مجھے فخر ہے کہ
تو نے میرے گلے میں
عشق کی ور مالا پہنائی

میں ناشکرا نہیں کہ تجھ سے
کروڑوں سروں والے راونوں پر
سوال قائم کروں یا اُن کی آڑلوں
کہ تو نے مجھ میں تمام راونوں، فرعونوں
اور ابوجہلوں کی آنکھوں میں
آنکھ ڈال کر اُنہیں خیرہ کرنے کا
گُن بھی بویا ہے

لیکن مجھے اعتراف ہے کہ
میں کسی بھی
کم نظر، بد دماغ اور شورہ پُشت
قاہر کے سامنے
لب بستہ کھڑا ہوتا ہوں
صُمّ، بُکمُ، عمیٰ۔



زمین کی صدائیں



یوں تو زمین کُچھ بولتی نہیں ہے
فصل دیتی ہے!
اور اپنی باہنیں کھولے رکھتی ہے
اس کی جٹاؤں کے آبشاروں سے
میگھ برستا رہتا ہے
اور اِس کے پیروں سے
زم زم اُبلتا رہتا ہے
ہاں یہ بانٹنے کے بہت کام آتی ہے

اس کو کبھی تلوار کے پلڑوں
اور زرہ بکتر کے باٹوں میں
تولا گیا
کبھی نیزوں کی انیّاں
اسکی بلندی کا اندازہ کرتی ہیں
کبھی میزائل اس کی لمبائی ماپتے ہیں
تو کبھی ایٹم بم
اسکی گہرائی جانچتے ہیں

زمین روندنے اور کُچلنے
کے کام آتی ہے
اس کی کھال پر
گہری سُرخ لکیریں ابھرتی ہیں

جو کہ نادیدہ طلسماتی کیڑے کی طرح
آہستہ آہستہ عظیم جال بُنتی ہیں

تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
کہ آج زمین کی کھال پر نئی لکیریں
اُبھر آئیں گی
جو کہ جھرّیوں میں تبدیل ہو کر
اسے اور بوڑھا کر دیں گی

یہ تو سچ ہے کہ
اس سے پہلے
تم نے آموں کی خوشبوؤں
اور اِملی کے ذائقوں کو

بانٹنا چاہا

آسمانی صداؤں کے لئے

اور نیلی چونچ والی

چنچل کبوتریوں کی پرواز کے لئے

فارِن رجسٹریشن دفتر کھول دئے تھے

تم نے آج کہا تو شاید ٹھیک ہی کہا ہوگا

کہ اب زمین کی جُھرّیاں بانٹنے کا

نیا موسمِ بہار آ گیا ہے



جو کہ نادیدہ طلسماتی کیڑے کی طرح
آہستہ آہستہ عظیم جال بُنتی ہیں

تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
کہ آج زمین کی کھال پر نئی لکیریں
اُبھر آئیں گی
جو کہ جھرّیوں میں تبدیل ہو کر
اسے اور بوڑھا کر دیں گی

یہ تو سچ ہے کہ
اس سے پہلے
تم نے آموں کی خوشبوؤں
اور اِملی کے ذائقوں کو

بانٹنا چاہا

آسمانی صداؤں کے لئے

اور نیلی چونچ والی

چنچل کبوتریوں کی پرواز کے لئے

فارِن رجسٹریشن دفتر کھولدئے تھے

تم نے آج کہا تو شاید ٹھیک ہی کہا ہوگا

کہ اب زمین کی جھُرّیاں بانٹنے کا

نیا موسمِ بہار آگیا ہے



سفید کبوتروں کی آمد



دور دِشاؤں کی شہزادی میرے گھر تو آئے
مہتابی کرنوں کا جھومر تیری پیشانی چومے
نیل گگن کی مست ہوائیں تیری زلفوں سے کھیلیں
بادِ بہاری کا اِک جھونکا دالانوں سے اُترے گا
جو تیری پازیب کے لمس سے گیت میں ڈھل کر بولے گا
چاروں سمت سفید کبوتر صحن میں آ کر کھیلیں گے
اور ہر موسم کے دِل میں یوں دھڑکن بن کر ناچیں گے
دور دِشاؤں کی شہزادی تم کو شاید یاد نہ ہو
جب تیری زلفوں میں گنگا بھور بھئے لہراتی تھی
میری آنکھوں کے ڈل میں بھی کئی شکارے چلتے تھے

میری اذانیں ہاری پربت پر اُسکو دہراتی تھیں
حضرت بل کے میناروں سے جب بھی چاند نکلتا تھا
کاشی کے دالان میں کڑواچوتھ کا روزہ کھُلتا تھا
تیرے سفید کبوتر اپنے کے جھنڈے جب لہراتے تھے
میرے گُلاب بھی استقبال کو خوشبو بھیجا کرتے تھے

دور دِشاؤں کی شہزادی میں اب بھی بھولا ہی نہیں
وقت کی آڑی ترچھی سرحد تجھ سے مجھ تک پھیل گئی
مہتابی کرنوں کا جھومر گرکر پل میں ٹوٹ گیا
اور تیری پازیب کے نوحے آنگن آنگن پھیل گئے
سارے کبوتر آن کی آن میں میرے ہاتھ سے چھوٹ گئے
اور گلابوں نے خوشبو سے پل میں ناطہ توڑ دیا
تیری مالا کا ہر دانہ ٹوٹا، بکھرا، دور ہوا
فصلیں سروں کی گنتے گنتے ٹوٹ گئی تسبیح میری

نذیر آزاد

دور دِشاؤں کی شہزادی مجھ کو پھر معلوم ہوا
تم نے میرے گھر کے آنگن سے پھر رشتہ جوڑ دیا
کاشی گنگا کے کچھ جوگی ڈل کی سیر کو نکلے ہیں
کاشی اور اجمیر کے بادل چاروں جانب پھیلیں گے
اور کئی سفید کبوتر میرے دِل سے بولیں گے

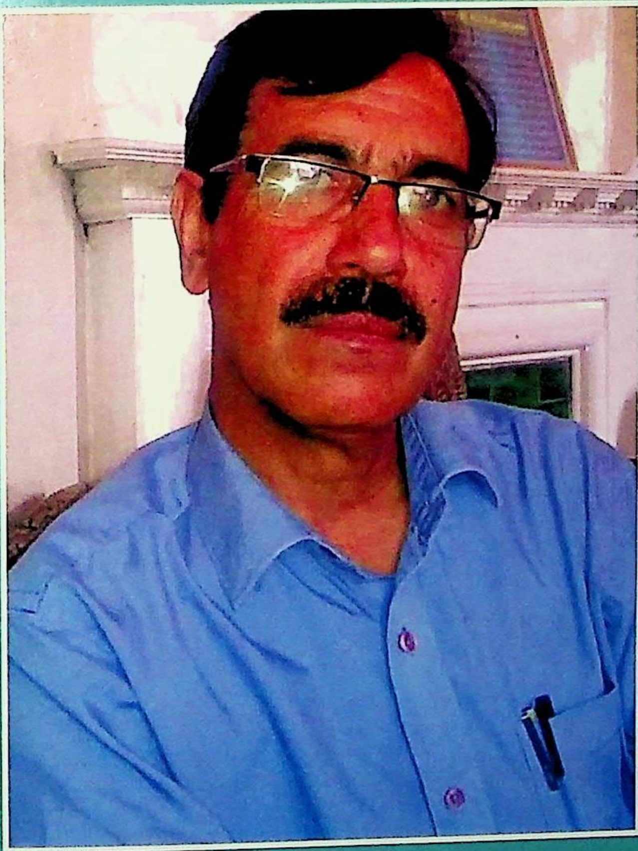
دور دِشاؤں کی شہزادی میرے گھر تو آئے گی
میں اپنی پلکوں پر تیری ڈولی لے کر آؤں گا
اور پھر اپنے دِل کی مہتابی کرنوں کا چادر
تیرے سر پر ڈال کے تجھ کو حضرت بل لے جاؤں گا

دور دشاؤں کی شہزادی اب کے تم جلدی کرنا
اپنے گھر کے سفید کبوتر میرے گھر بھجوا دینا



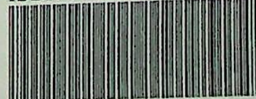
PARDA SUKHAN KA

BY:
NAZIR AZAD



Nazir Azad

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA


ISBN 978-93-88105-57-6
978-93-88105-57-6
www.ephbooks.com